ابوالعصر غلام جیلانی میرزا
تنکانہ صاحب

علّامہ اقبال کا تصوّر زمان و مکاں

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اپنے شعر و فلسفہ میں زمانے کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ براہِ راست قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔ مغربی فلاسفہ میں سے برگساں نے زمانے پر بحث کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ وہ بھی اقبال کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکا۔ بلاشبہ مکاں کی بحث کو نظریۂ اضافیت اور نظریہ کوانٹم (مقدار) نے بڑی حد تک حل کر دیا ہے، لیکن زمانے کا تصوّر مغربی فلاسفہ سائنس دانوں کے نزدیک ہنوز سربستہ راز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکان تو تجربے میں آسکتا ہے لیکن زمان انسانی تجربے میں نہیں آسکتا، کیونکہ تجربے کی بنیاد گردشِ لیل و نہار پر ہوگی اور خود لیل و نہار کا تعلق کس زمان سے ہے۔ سائنس کے پاس اس کا کوئی تجربہ نہیں۔

اقبال کے سامنے چونکہ قرآن حکیم ایک حقیقت ثابت ہے اس لئے وہ زمان کا ایسا تصور پیش کرتے ہیں، جو ایک طرف حقائق کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی اور معاشرے کے لئے حرکیاتی عملی اور ارتقائی تصوّر پیش کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

ترجمہ:۔ زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، ہاں وہ لوگ جو یقین و اعتماد کے ساتھ تعمیری (صالح) کام سرانجام دیتے ہیں اور وہ حقیقت شناسی کی تلقین کرتے ہیں اور مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور وہ زمانے پر قابو پالیتے ہیں اور حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتے ہیں۔)

علامہ اقبال کے نزدیک زمانہ ایک کاٹ پھینکنے والی تلوار ہے۔ بیکاروں اور کاہلوں کو ختم کر دیتی ہے لیکن اہلِ ہمت اس پر قابو پا کر اس کو اجتماعی مقاصد اور قومی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ قرآن حکیم کی اوپر کی آئت کریمہ میں تصریح کی گئی ہے۔ بادی النظر میں انسان کی زندگی میں ہر دن اور ہر گھڑی اس کی عمر کو کم کرتی چلی جا رہی ہے۔

بجتا ہے جو گھڑیال تو کرتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

اقبال کے نزدیک اگر انسان اپنی خودی کو ایمان اور عمل صالح سے مضبوط کر لے تو یہ گردشِ لیل و نہار اس کی عمر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ذاتِ اقدس جو ہمیشہ زندہ ہے، جس کو کبھی فنا نہیں، اس پر پورا اعتماد کرو اور کائنات کے اندر تعمیری مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤ، وہ ذات اقدس اپنے بندوں کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس پر اعتماد کافی ہے۔

بلاشبہ انسان کا پیکر وقتی اور زمانی آنی اور فانی ہے لیکن انسانی خودی جس کو قرآن حکیم نے "امر الٰہی" کہا ہے وہ اگرچہ خدا کی پیدا کردہ ہے لیکن آنی اور فانی نہیں ہے۔ اس کی حیات حیاتِ حق سے قائم ہے اور اس کی بقاء بقائے حق سے وابستہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیاتِ حق کا تعلق کس زمانے سے ہے؟ دوامیت یا ہمیشگی کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کی اوّلین اور بنیادی صفت حیات ہے۔ جو ذات کا عین ہے اور حیات کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بخود قائم بھی ہو اور مقوم بھی ہو۔ یعنی ارتقائی حرکت بھی ہو اور محرک بھی "الحیّ القیوم" کا یہی مطلب ہے اسی قیومیت اور محرک ہونے کا نام زمانہ یا دہر ہے۔ ایسا زمانہ بھی تھا جب انسان کا وجود نہیں تھا۔ اقبال نے زمان کی حقیقت کا ادراک اور حیات کا تصور ایک مسلسل حرکت کے طور پر کیا ہے۔ زمان ایک مسلسل حرکت ہے۔ انسانی زندگی اور تاریخ کا راستہ پہلے سے بنا بنایا نہیں ہے۔ زمانے کا ایک پہلو تو وہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ مرور (گذران) ہے اور دوسرا پہلو وہ ایک رجحان ہے جو زندگی کسی مقصد اور منتہا کی طرف آگے بڑھنے میں ظاہر کرتی ہے، جو ابھی نامکمل ہے یہ ایک آزاد فعلیت ہے۔ جس میں زندگی کی قدریں تجریدی اور نظریاتی تاریکی سے نکل کر عمل کی دنیا میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ زمانہ واجب الوجود کی وہ جہت ہے۔ جس میں حیات انسانی کی تکمیل ہوتی ہے اور صفات باری کی جلوہ آرائی ہوتی ہے۔ زمانے کو قدروں

کی روشنی میں دیکھنے کا نام تاریخ ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا؟
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

مغربی مفکروں کے نزدیک زمانہ حوادث و واقعات کے تواتر سے عبارت ہے۔ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور جو صرف طبیعات کے اٹل قوانین سے متعین ہوتا ہے۔ اس دوران میں انسانی زندگیاں پیدا ہوتی ہیں اور مرتی رہتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک زمانے کا احساس و تجربہ ہمیں اپنی زندگی کے داخلی پہلو میں ہوتا ہے اور اس طرح خود انسانی ذات حقیقت کی پیمائش کا پیمانہ اور معیار ٹھہرتی ہے۔ بجائے عقل کے کہ جس کا کام خط کو نقطوں میں اور ساعت کو لمحات میں تقسیم کر کے دیکھنا ہے۔ ذوقِ وجدانی سے زمانے کی ماہیت کا راز ہم پر کھلتا ہے۔ "پوچھا کتنی دیر ٹھہرا رہا کہا ایک دن یا آدھا کہا نہیں بلکہ تو سو برس ٹھہرا رہا۔"

علم و عقل کو جہاں لمحات کا دوران نظر آتا ہے۔ ذوق و وجدان وہاں نشو و نما اور ارتقاء کی جھلکیاں دیکھ لیتا ہے۔ زندگی کو تسلسل کی لڑی میں نسل آدم یا نوع انسانی کے حیاتی تصور میں سمجھنے کی جتنی بھی سعی کریں گے، زندگی کی نوعیت کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ زندگی کا مادے سے پیوست ہونا اور زمانے میں ارتقاء اب تک ایک راز ہے جس کا سائنس اور فلسفہ کو علم نہیں ہو سکا۔ قرآن کا ارشاد کہ ذات باری کے "کن فیکون" سے کائنات وجود میں آئی تو کیا زمانہ کائنات کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوا؟ یا خود کائنات کی تخلیق زمانے میں ہوئی؟ جب ہم کہتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق ہوئی تو ہمارا نقطۂ نظر ظاہر اور سطحی ہوتا ہے۔ انسانی وجود کے باطنی اور داخلی تصور سے تخلیق عام پر زمانی اطلاق نہیں ہوتا خالق کائنات ازل ہے۔ اس لئے زمانہ حرکت اور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں نے زمانے کو معروضی حیثیت

سے دیکھا۔ انہوں نے اسے ایک زبردست قوت خیال کیا۔ بلاشبہ کائنات عالم پر زمانے کا پورا پورا تصرف ہے۔ لیکن انسانی خودی ایک آزاد فاعلیت ہے۔ وہ زمانے کی گرفت سے بچ نکلتی ہے۔ انسانی خودی کا زمانے کے ہاتھوں بے بس اور مجبور ہونا قرآن حکیم کے نزدیک کفر ہے۔ کافروں کا عقیدہ ہے کہ زندگی صرف یہی حیات دنیا رہی ہے اور ہمیں زمانہ زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ سورۃ العصر میں اس عقیدہ کی صاف تردید ہے۔ اقبال کہتا ہے :

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا نام
اور زمانے میں بھی ہیں جن کا نہیں کوئی

خودی جب اپنا تعلق خدا سے جوڑتی ہے تو زمانے پر تصرف حاصل کر لیتی ہے اور کائنات کی تسخیر پر قدرت حاصل کر لیتی ہے "بالِ جبریل" میں ایک نظم کا عنوان زمانہ ہے۔ زمانہ اپنے مخصوص انداز میں کائنات حیات کے اسرار و رموز بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں اشیائے کائنات کو ہر آن فنا کرتا رہتا ہوں۔ گذری اشیاء کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں تو فوراً ظہور میں آنے والی اشیاء کا دلدادہ ہوں۔ میری صراحی سے نئے واقعات و حوادث بوندوں کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔ لوگ جنہیں دن رات کہتے ہیں وہ میری تسبیح کے دانے ہیں۔ جنہیں میں شمار کرتا رہتا ہوں۔ اگرچہ ہر کسی کا آشنا ہوں۔ لیکن میری رسم و راہ ہر ایک سے جداگانہ ہے کائناتِ فطرت پر میں حکمران ہوں لیکن نفس انسانی مجھے اپنے اندرونی جذب سے تخلیق کرتا اور مجھ پر قابو پاتا ہے میں کہیں سوار ہوں، کہیں سواری کہیں تازیانۂ عبرت میرے پیچ و خم اتنے پراسرار ہیں کہ نجومی کی آنکھ ان کا پتا نہیں چلا سکتی۔ ہاں مجھے صرف عارف "پہچان" اور جان سکتا ہے جو خودی کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر رموزِ کائنات کا راز دان بن گیا ہو۔

ہاں! عارف کی آنکھ اور اس کا قلب زمانے کے داؤ پیچ کو بخوبی سمجھتا ہے۔ عام آدمی کی نگاہ میں زمانہ ایک طول طویل عمل کی داستان ہے وہ جب کائنات فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اشیائے کائنات میں جہاں اس کو اپنے سامنے بے شمار اشیاء بنتی بگڑتی نظر آتی ہیں۔ وہاں ایسی بھی نظر آتی ہیں جو اس کی عمر کے

ہر حصے میں سر مو تبدیل نہیں ہوئی ہیں اور ان کو اپنے تجرباتی قیاسات کی رو سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں برسوں سے موجود جاننے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ زمانے کو دن رات اور ماہ سال کی حیثیت سے ناپتا ہے۔ لیکن جب یہی عام آدمی اپنی عمر پر پھیلے ہوئے واقعات پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہے تو اس کا سراغ اس کو خارجی عالم میں یعنی کائنات فطرت میں کہیں نہیں ملتا۔ مگر اس کے حافظے میں محفوظ ہوتا ہے۔ کم از کم اپنی عمر کے اعتبار سے برسوں کے حوادث اس کے نہاں خانۂ دل میں موجود ہوتے ہیں، جن کو وہ پلک جھپکتے میں دیکھ لیتا ہے۔ بلکہ دیکھ دیکھ کر بیان کرتا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم فطرت کے ماہ و سال قلبِ انسانی میں گم ہو کر ایک واحد آن کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

جہانِ ما کہ پایانے ندارد　　چو ماہی دریم ایام غرق است
یکے بر دلِ نظر وا کن تا بینی　　یم ایام دریک جام غرق است

جس طرح ریاضی میں خط مستقیم کو آگے بڑھانے کے لئے پچھلے حصے کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح زندگی کو مستقبل کی طرف بڑھانے کے لئے ماضی کو اپنے ساتھ رکھنا پڑتا ہے یہاں آکر ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کی ایک آنکھ ماضی کی طرف نگاہ رکھتی ہے اور دوسری طرف آنکھ مستقبل کی متلاشی ہوتی ہے، اور نقطۂ حال ان دونوں کو ملائے رکھتا ہے۔ جہاں حال سے غفلت ہوئی ماضی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے[1] انسان کی ناکامی کی وجہ ہمیشہ حال سے غفلت ہوتی ہے۔ حال کی روشنی مفقود ہونے سے ماضی اور مستقبل دونوں تاریک ہو جاتے ہیں۔ ماضی، حال و مستقبل تینوں مل کر مقاصد کی تخلیق کرتے ہیں۔ خارجی دنیا میں یہ تینوں برسوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن داخلی دنیا میں یہ سب کچھ ایک لمحہ میں وارد ہو جاتا ہے۔ زمانے کی تاریخ عالم کا پس منظر پیش کرتی ہے۔ جس پر فطرت اور انسان کے بے شمار نقش و نگار ثبت ہیں۔ اس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔ ذہنی ضرورت کے لئے ہم زمانے کو مختلف ادوار میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ تاکہ حقیقت کی تھوڑی بہت گرفت ہو سکے۔ زمانہ قلب انسانی میں ناقابل تقسیم و تجزیہ ہے۔ اندرونی لحاظ سے لمحات ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ شعور و احساس کے تانے بانے سے ایسے وابستہ ہوتے ہیں کہ ہم

---

[1]: اور ساتھ ہی مستقبل بھی تاریک ہو جاتا ہے

انہیں ایک دوسرے میں مدغم کر سکتے ہیں۔ چونکہ اندرونی لمحات ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ اس لئے انسانی خودی جو اُن سب کو سمیٹتی اور سموتی ہے اپنے عمل میں آزاد اور خود مختار ہوتی ہے اسی لئے اقبال کے نزدیک انسان کامل "شہسوار اشہب دوراں" ہے اور "فروغ دیدہ امکاں" ہے یعنی زمانے کے گھوڑے کا اعلیٰ درجہ کا سوار اور عالم فطرت کی نرگسی آنکھ کی روشنی اور بینائی،

آزاد خودی مکانی حیثیت سے لامکان ہے لیکن دوران کے اندر رہتی ہے۔ وہ آزاد فعلیت ہے۔ جس کا کام تخلیق اور اثر آفرینی ہے۔ حق و صداقت کی شاخیں مختلف زمانوں میں خودی کے تصرف سے بدلتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ یعنی "جب ہم کسی صداقت کے نشان کو بدلتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ بہتر یا اس جیسا تو ضرور لے آتے ہیں" یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ صداقت کا معیار بدل جاتا ہے نہیں بلکہ صداقت کا قالب یا ظہور تبدیل ہوتا ہے اور وہ زمانے کا خارجی تقاضا ہوتا ہے۔ زمانہ کہتا ہے کہ آفتاب میرے دامن میں اور ستارے میرے گریبان میں ہیں۔ اگر مجھے دیکھے گا تو میں کچھ بھی نہیں اور اپنے اندر دیکھے گا تو میں جان ہوں، شہر و بیابان بھی ہوں، محلات و شبستان بھی ہوں، درد بھی ہوں، دوا بھی ہوں، جہاں کو تباہ کرنے والی تلوار بھی ہوں، آب حیات بھی ہوں، یہ چنگیزی و تیموری تو میرے راستے کا مشتِ غبار ہیں اور اقوام مغرب میرے الاؤ کا ایک شرارہ ہیں، یہ انسان اور جہاں میرے نقش و نگار ہیں اور جواں مردوں کا خون میری بہار کی آرائش ہے، میں جلانے والی آگ بھی ہوں، گل و گلزار بھی ہوں ٹھہرا ہوا بھی ہوں اور سفر پہ بھی ہوں، عجیب تماشا دیکھا کہ بادہ امروز میں آئندہ زمانے کا نشہ ہے اور میرے ضمیر میں سینکڑوں خوبصورت جہاں پوشیدہ ہیں اور ستارے میرے نشانِ راہ ہیں۔ اور سر بفلک چوٹیاں زینے ہیں اگر انسان کا لباس ہوں تو خدا کا بھی پیراہن ہوں، میرا افسون تقدیر ہے، تیرا تدبیر تو عاشق لیلیٰ ہے تو میں دشتِ جنوں، تیرے وہم و گمان سے روح کی طرح پاک ہوں، تو میرا راز ہے تو ساز آہنگ اور گرمی محفل ہے اے آب و گل کے آوارہ دل کا مقام حاصل کر اور دیکھ کہ زمانے کا بحرِ بیکراں ایک جام میں سمایا ہوا ہے۔ اسی دل کی موجِ بلند سے میرا طوفان برپا ہے۔

اقبال کے تصور زمان کے متعلق یہ مختصر اشارات ہیں، جن کو میں نے زیادہ سے زیادہ آسان لفظوں میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں جو فلسفانہ بحث ہے اس سے تو بڑے بڑے مدعیان علم و فن کا دماغ بھی چکرا تا ہے۔ بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اقبال کے "تصور زماں" کے پہلو سے

انسان کی سوچ کو جدوجہد کی راہ پر ڈالا جائے اور محض مفاد عاجلہ اور حیاتِ دنیا پر ہی قناعت نہ کی جائے۔ بلکہ آنے والے زمانے کے لئے زادِ راہ بھی مہیا کرنے کی طرح ڈالی جائے، جس طرح چاہیں زمانے کو بدل دیں، اہل دل پست ہمت ہیں۔ جنہیں اگلا زمانہ چاہیے۔

"تخلیقی حرکت کو باہر سے دیکھیں یا اس کا ذہنی تجزیہ کرنا چاہیں تو یہ ہزاروں سال کا عمل نظر آئے گا۔ لیکن دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو تخلیق کا عمل ایک غیر منقسم عمل ہے اور اس قدر جلد انجام پاتا ہے، جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ خالص دوران کے اندرونی تجربے کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں اس لئے کہ خود زبان اور الفاظ کی ساخت روزمرہ کے عملی کاموں کی ضرورت کے تحت تواتر، زماں کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال سے کافی روشنی پڑے گی۔ طبیعیات کی رو سے سرخ رنگ کے احساس کی وجہ حرکت موجی کی تیزی ہے۔ جس کے ارتعاش (ویو) کا تصور چار کھرب فی سیکنڈ ہے اگر ہم خارجی طور پر اس تصور کا شمار ایک لاکھ ۸۶ ہزار ارتعاش فی سیکنڈ کریں (جو ادراکِ نور کی حد ہے) تو ۶ ہزار سال درکار ہوں گے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آنِ واحد میں سُرخ رنگ کا ادراک ہو جاتا ہے اور اس بے شمار تصور اور تواتر ارتعاشات کو آنِ واحد میں گرفت میں لے آتے ہیں۔ اِس طرح ذہن زمان متواتر کو دوران میں مبدّل کر دیتا ہے۔ غرض کہ اس طرح قدرِ آفرین خودی عمل اور مؤثر خودی کی کوتاہی کو دور کر دیتی ہے اور زمان و مکاں کے تغیّر کو جو مؤثر خودی کے لئے لازمی ہے۔ شخصیت کی مربوط کلیت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ خالص دوران ہمارے شعوری تجربے میں جس طرح منکشف ہوتا ہے۔ وہ مختلف لمحات کی پے در پے آمد و شد کی ایک ایک لڑی نہیں ہے بلکہ ایک عضوی کل ہے۔ جس میں ماضی حال کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اور مستقبل پہلے سے بندھا ٹکا اور مقرر شدہ نہیں بلکہ ایک کھلے امکان کے طور پر موجود رہتا ہے۔ قرآن پاک جس کو "تقدیر" کہتا ہے وہ زمانہ ہی ہے جب کہ اس کو عضوی کل کے طور پر دیکھا جائے گویا وہ زمان ہے جبکہ اس کے امکانات سے قبل اس پر نگاہ ڈالی جائے۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)